٦

دنیازاد

کتابی سلسلہ

دنیا دنیا دہشت ہے

حسن منصور نے کم ہی افسانے لکھے ہیں مگر موضوعات اور اندازِ بیان کی وجہ سے وہ جدید سندھی افسانہ نگاروں میں اپنی علیحدہ اور واضح شناخت کے حامل ہیں۔ حسن منصور ایک انگریزی روزنامے سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے یہ افسانہ ان دنوں لکھا تھا جب کراچی دہشت گردی کی لپیٹ میں آکر جرائم اور فسادات کی آماج گاہ بن گیا تھا۔

حسن منصور
ترجمہ: اسلم خواجہ

میں اور وہ

اس کی رفتار تیز ہوتے ہی میں نے بھی اپنے قدم تیز کر دیے۔ رات کا ڈیڑھ بجا تھا اور یہ شہر کا انتہائی ویران علاقہ تھا۔ اگر علاقہ بارونق بھی ہوتا تو بھی آکاش پر پھیلا رات کا کالا دیو اُس وقت وہاں فقط ویرانی کا رقص دیکھنا پسند کرتا۔ لیکن یہ ویران علاقہ کالے دیو کی پسند اور ناپسند سے بالکل لاتعلق تھا یا شاید اس کی خواہشات کا مظہر تھا۔

وہ وہاں سے نہ گزرتا تو اس وقت وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا۔ میں بھی نہیں! وہ وہاں سے گزر رہا تھا اس لیے میں بھی وہیں تھا اور اس کے تعاقب میں تھا۔

اُس نے اپنی رفتار تیز کرتے ہوئے خوف سے میری جانب دیکھا، میں مسکرایا اور خوف کی ریکھائیں اس کے چہرے پر گہری ہوگئیں۔ مجھے لگا کہ اس کا چہرہ کہیں گم ہوگیا تھا اور صرف ان گنت سہمی اور کانپتی ہوئی ریکھائیں میری جانب دیکھ رہی تھیں۔

وہ کم و بیش دوڑنے لگا تھا، اس دوران وہ کئی مرتبہ راستے میں پھیلے ہوئے پتھروں سے الجھ کر لڑکھڑا بھی چکا تھا۔ وہ شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا اور ہاتھ میں بریف کیس تھا، جس پر اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔ یقیناً اس میں کوئی قیمتی چیز تھی۔

سڑک کا ایک کھمبا جو عام طور پر صرف دن میں جلتا نظر آتا تھا، نہ جانے کیوں خلافِ معمول اس وقت جل رہا تھا، شاید بجلی کا محکمہ کسی فنی خرابی کا شکار تھا۔ لیمپ پوسٹ کے قریب سے گزرتے

ہوئے وہ اچانک ایک لمحے کو، فقط ایک لمحے کو اپنی جگہ پر ساکت ہو گیا اور میری جانب دیکھنے لگا۔ میرے لیے اس کا یہ قدم غیر متوقع تھا۔ اس لیے میں رکتے رکتے بھی چند قدم آگے نکل گیا۔ ہم دونوں کے درمیان فاصلہ کچھ کم ہو گیا۔ میں نے فقط اس لمحے میں اس کا مکمل جائزہ لیا۔ مختصر لیکن روشن آنکھوں کے اس مالک کی عمر چالیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ کچھ سال قبل تک یقیناً خوب صورت رہا ہوگا لیکن اب وقت سے پہلے اس کا چہرا کسی مرجھائے ہوئے پھول کی طرح اور کسی خوب صورت عمارت کی باقیات جیسا لگ رہا تھا۔ بکھرے بالوں، بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں میں سفیدی اتری ہوئی تھی۔ قد مناسب تھا لیکن بدن کی اوچ اس پر تیزی سے چھانے والے بڑھاپے کی یلغار کو واضح طور پر بیان کر رہی تھی۔ پسینے میں نہائے ہوئے چہرے پر ثبت خوف کی ریکھائیں اور زیادہ گہری ہوگئی تھیں اور یہ اس پر میری مہربانی تھی۔

میں دوبارہ مسکرا دیا۔ یہ دیکھ کر اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں اور وہ پہلے سے زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ مجھے اس فاصلے کے ساتھ اس کے تعاقب میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ میں مضبوط نوجوان تھا اور روزانہ تین میل دوڑنا میری عادت تھی۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اب ہانپنے لگا ہوگا۔ میں نے فاصلہ کم کرنے کے لیے اپنی رفتار بڑھائی۔ مزید قریب ہونے پر اس کی سانس کی آواز بھی سننے لگا۔ ویرانی اور خاموشی میں تو کاغذ کو بھی اپنا وجود محسوس ہوتا ہے، میرے قریب پہنچنے پر اس نے بھی میرے قدموں کو محسوس کر لیا اور باقاعدہ دوڑنے لگا۔ بریف کیس پر اس کی گرفت مزید سخت ہوگئی اور اسے لگ رہا تھا کہ اس کی کھردری لیکن کم زور انگلیاں کسی نہ کسی طور بریف کیس کے ریگزین میں پیوست ہو جائیں گی۔

اب ہم جس جگہ پہنچے تھے اس سے کچھ فاصلے پر پولیس چوکی تھی لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ اس وقت تو کتے بھی سو چکے تھے اس لیے سپاہیوں کے جاگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر اخبارات کے دفتر تھے جہاں رات گئے تک کام کرنے والے اخباری کارکنوں کی تھوری بہت آمدورفت جاری رہتی تھی۔ اگر وہ یوں ہی دوڑتا رہتا تو اس علاقے میں پہنچنے میں دس منٹ ضرور لگ جاتے۔ اس کے لیے اسٹمنا کی ضرورت تھی۔ مجھ میں اس کی کمی نہیں تھی اور میں نے سنا تھا کہ خوف بھی کم زور سے کم زور شخص میں ایسا ہی غیر معمولی اسٹمنا پیدا کر دیتا ہے۔ وہ بھی خوف کا شکار ایک کم زور شخص تھا اور ہانپنے کے باوجود لمحہ بہ لمحہ مزید تیز دوڑ رہا تھا۔ وقت میرے لیے کم ہو رہا تھا، اس لیے مجھے جلد ہی کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔

پولیس چوکی کے گیٹ پر پہنچ کر وہ تقریباً رک گیا اور بے یقینی سے تاریکی میں ڈوبے تھانے کو دیکھنے لگا۔ اُسے یقیناً مایوسی ہوئی ہوگی۔ رات کو تھانے بھی قبرستان بن جاتے ہیں۔ جہاں صرف بے گناہ لوگوں کے جسموں پر تڑپتے زخم اور نشتر ہی جاگتے ہیں۔ لیکن اگر دن بھی ہوتا تو اُسے کیا حاصل ہوتا۔ شریف اور کم زور لوگوں کا پولیس والوں اور سیاست دانوں سے کیا سروکار!

کچھ دیر کے لیے وہ نہ جانے کس سوچ میں گم ہوگیا۔ پھر اچانک چونک کر میری جانب دیکھنے لگا تو میں نے بھی اپنی رفتار کم کر دی اور اُس کے مزید قریب پہنچ گیا تھا۔ میرے چہرے پر بچی مسکراہٹ اُسے پریشان ہی کر رہی تھی۔ اُس نے میری جانب دیکھتے ہوئے، میری طرف آنے کا ارادہ کیا۔ شاید وہ مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں تھی اس لیے میں زیادہ دیر اپنی مسکراہٹ برقرار نہیں رکھ سکا، اس نے بھی جلدی اپنا ارادہ تبدیل کر کے مسلسل بھاگنے کو ترجیح دی۔ اُس کے ارادے میں تبدیلی میرے لیے کافی تھی۔ میرے چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ لوٹ آئی اور دوڑ دوبارہ شروع ہوگئی۔

لیکن کچھ ہی دیر میں وہ لڑکھڑانے لگا اور مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے کوئی شرابی برداشت سے زیادہ پینے کی وجہ سے ہوش گنوا رہا ہو، اُس کی رفتار اب کم ہونے لگی تھی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح تیز ہوگئی تھی اور اس کے ساتھ ہی وہ بڑبڑانے اور رونے بھی لگا تھا۔ میرے جگر میں جیسے کچھ چبھ سا گیا۔ مجھ میں یہی کم زوری تھی۔ لیکن اس پر قابو پا کر میں نے کھیل جاری رکھا۔ مجھے مزا بھی آنے لگا تھا۔ کچھ دور پہنچ کر وہ زور سے لڑکھڑایا اور تارکول کی تازہ بنی ہوئی سڑک پر چاروں شانے چت ہوگیا۔ میں نے اپنی رفتار کم کر دی اور دھیرے دھیرے اس کی جانب بڑھنے لگا۔ مجھ میں گڑی اُس کی آنکھیں خوف کے مارے پھیل کر ساکت ہوگئیں۔ بریف کیس اب بھی اُس کے دونوں ہاتھوں میں تھا اور وہ اب بھی اس سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھا۔ جب ہمارے درمیان چار پانچ قدموں کا فاصلہ رہ گیا تو خوف کے ساتھ رحم کی التجا والے عکس بھی اس کی آنکھوں میں اُمڈ آئے تھے۔ اُس کے ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا تھا یا شاید اُس نے جو کہا وہ میں نے سنا نہیں۔ اس کا پورا بدن کانپنے لگا تھا اور پسینہ دھارے بنا کر تارکول میں جذب ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا تھا۔

میں نے یہ فاصلہ بھی ختم کیا اور سیدھا جا کر اُس کے سر پر کھڑا ہوا۔ میرے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی، جو یقیناً سفاک اور بے رحم ہوگی، اچانک اُس کا جسم پلٹا اور وہ اُلٹا ہو کر زمین سے

چپٹ گیا۔ بریف کیس اُس کے نیچے تھا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ اُس کا جسم غیر متحرک تھا۔ اُس کی نبض دیکھی تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا جسم شانت ہوگیا تھا لیکن چہرے پر خوف و ہراس کی میری بخشی ہوئی ریکھائیں مستقل ہوگئی تھیں۔ آنکھیں دو سوالیہ نشان بن گئیں تھیں، جس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

میں نے اُس کے نیچے دبے ہوئے بریف کیس کو کھینچ کر باہر نکالا اور تیزی سے سڑک کی دوسری جانب بڑھنے لگا۔ میرا دل اُن سینکڑوں دہشت گردوں کے لیے تعظیم سے بھرا ہوا تھا، جنھوں نے شہر کے لوگوں کو مستقل خوف کی سوغات دی ہے۔ یہ سوغات میرے لیے ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے میں ہر رات خالی ہاتھوں سے کوئی نہ کوئی شکار کرتا ہوں اور پولیس اور دوسرے بھائی بندوں کو حصہ دیے بغیر اپنی روزی روٹی کماتا ہوں۔ دعا گو ہوں کہ خوف اور دہشت کی یہ لہر لمبی عمر پائے۔

بشکریہ: دی لٹل میگزین، نئی دہلی